آہ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی!

(۲۰۲۰-۱۹۳۵)

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، آکسفورڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

نقاد جہان آباد کا خاموش ہو گیا

۲۵ دسمبر کو پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کا سانحۂ ارتحال رواں صدی میں اردو دنیا کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ کچھ دنوں پہلے خبر ملی تھی کہ وہ دہلی میں ہیں اور انہیں کووِڈ ۱۹ ہو گیا ہے۔ افاقہ ہوا اور اپنے وطن الہ آباد چلے گئے۔ لیکن شاید وائرس کے اثرات ابھی جسم کے اندر موجود تھے، اور یوں کورونا ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ اور اب ہمارے درمیان ایک ایسا شخص نہ رہا جو بیک وقت عالم، محقق، ادیب، شاعر، ناول نگار، مترجم، اور سب سے بڑھ کر ایک روشن دماغ تھا۔ آہ! نقاد جہان آباد کا خاموش ہو گیا۔

مقام شناسی

یہ اسی عقل مفکر کا کرشمہ تھا کہ اس نے صرف اپنے بل پر اردو تنقید کو اکیسویں صدی میں داخل کیا، اور دنیائے اردو اس عظیم نقاد کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی جس کی تنقیدی بصیرت منفرد تھی، اور جس نے اپنے عصر کو تنقید کی نئی جہتوں اور اچھوتی راہوں سے روشناس کرایا۔

شبلیؔ و حالیؔ کے بعد اردو تنقید کی مسند آزاد، سلیمان، نیاز فتحپوری، اور ماجد نے سنبھالی۔ پھر اس کی وراثت ان لوگوں کے حصہ میں آئی جنہوں نے ادبی مطالعہ کے ان وسائل سے بھی استفادہ کیا تھا جو مغرب کے ذریعہ فراہم ہوئے تھے، اور جو مغربی تنقید کے رجحانات سے براہ راست واقف تھے۔ وہ اردو کو ان نئے نئے خیالات سے مالامال کرنے کی سعی پیہم کر رہے تھے۔ ان میں نمایاں تھے: مجنوں گورکھپوری، حسن عسکری، کلیم الدین احمد، اور آل احمد سرور۔ ان بزرگوں کے بعد شمس الرحمن فاروقی تنہا رونق آرائے بزم رہے۔ جہاں گئے چھائے رہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا، دنیائے علم و ادب نے ان کی خدمتوں کو سراہا، اور سنہ ۱۹۹۲ میں انہیں برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ سرسوتی سمّان دیا گیا۔

شب خون

سنہ ۱۹۷۸ سے میرا قیام ندوہ میں بحیثیت طالب علم، پھر بحیثیت مدرس رہا۔ اس دوران شمس الرحمن فاروقی سے آشنا ہوا۔ ان کے رسالہ شب خون کا نام سنا۔ ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ، ادیبوں اور شاعروں کی بے راہ روی پر اچانک اور بے محابا حملہ۔ رسالہ کا نام الصارم المسلول، السیف البتار، اور صمصام الاسلام کے قبیل کا محسوس ہوا۔ اگر یہ کسی ناول کا نام ہوتا تو اتنی حیرت نہ ہوتی، لیکن ایک ادبی اور تنقیدی مجلہ کا یہ نام غیر ادبی لگا اور ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ نام سے قطع نظر میں اس پرچہ کے قارئین میں شامل ہو گیا، اور شمس الرحمن فاروقی کی ادبی عظمت دن بدن دل میں راسخ ہوتی گئی۔

سنہ ۱۹۸۵ کے شمارے میں ان کی ایک تحریر بعنوان میر کے کلام میں عاشق کا کردار شائع ہوئی، اس نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں لکھتے ہیں: "میر کی زبان کے اس مختصر تجزیئے اور غالب کے ساتھ موازنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ میر اور غالب میں اشتراک زیادہ ہے، افتراق کم۔ استعمال زبان سے ہٹ کر دیکھئے تو بھی اشتراک کے بعض پہلو نظر آتے ہیں۔ اوپر میں نے عرض کیا کہ میر کے بعد غالب ہمارے سب سے بڑے انفرادیت پرست ہیں اور ان دونوں کی انفرادیت پرستی ان کے کلام سے نمایاں ہونے والے عاشق کے کردار میں صاف نظر آتی ہے۔" مذکورہ شمارہ میں ان کا ایک مضمون بعنوان تفہیم غالب تھا۔ سنہ ۱۹۸۹ میں اسی نام سے ان کی مشہور کتاب شائع ہوئی۔

سنہ ۱۹۸۶ کے ایک شمارہ میں شائع شدہ ان کی ایک تحریر بعنوان افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی، جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے: "نئے افسانے کے بارے میں عام طور پر اس تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس کو روایت سے اللہ واسطے بیر ہے، اس میں روایت شکنی کا رجحان ہے۔ اس میں بیانیہ کی روایتی خوبیاں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ افسانے سے بیانیہ کے اخراج کا ذمہ دار جدیدیت کو ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی جدیدیت کے جرائم کی فہرست میں بیانیہ کا قتل بھی شامل ہے۔ چنانچہ بعض حلقوں کی طرف سے جب افسانے کی موت کا اعلان ہوا تو اس کے کچھ دنوں بعد (یعنی تحقیق و تفتیش کی کارروائی پوری کرنے کے بعد) یہ بھی کہا گیا کہ جدیدیت نے افسانے کو چیستان بنا کر ان ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا جو انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار کو، افسانے کا افسوں جانتے تھے۔"

سنہ ۱۹۹۰ میں ان کی کتاب **شعر شور انگیز** شائع ہونا شروع ہوا، یہ چار جلدوں (جلد ۱، جلد ۲، جلد ۳، جلد ۴) میں مفصل مطالعہ کے ساتھ میرؔ کی غزلیات کا محققانہ اور معیاری انتخاب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے مطالعۂ میرؔ کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیا، اور اس سے فاروقی صاحب کے انتقادی شعور کو مزید شہرت ملی۔ اس کی تمہید میں لکھتے ہیں: "میری تحریر میں نغمۂ داؤدی تو شاید نہ ہو، لیکن میر کی عظمت کو الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش ضرور ہے۔ اس کوشش میں آپ کو دماغ کے تیل کے ساتھ ساتھ خونِ جگر کی بھی کارفرمائی شاید نظر آئے۔"

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ

پہ میرے شور نے روئے زمین تمام لیا

☆☆☆

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز

تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

ادب کی معیاریت

ندوہ میں شب خون اور شمس الرحمن کی تحریروں کا ذکر محدود تھا، مجھ سے جونیئر دو تین طلبہ ادب کے جدید رجحانات سے متاثر تھے۔ ان سے صحبت رہتی، اور ان کی دیکھا دیکھی شبخون پڑھنے لگا۔ اسی دوران ادبی پیاس بجھانے کے لئے لکھنؤ کی لائبریریوں کا بھی طواف کیا۔ دانش محل جاتا اور گھنٹوں وہاں ادب و تنقید کی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ اس کے مالک علم دوست تھے۔ انہیں تجارت سے زیادہ اردو ادب کے فروغ سے دلچسپی تھی۔ بہت سستے داموں کتابیں فروخت کرتے۔ پھر بھی ہم جیسے لوگ ان کے مکتبہ کو لائبریری کے طور پر استعمال کرتے۔ سننے میں آیا ہے کہ دانش محل بند ہو گیا۔ جب تجارت تجارت کے اصول پر نہیں ہو گی تو انجام یہی ہو گا۔

شبخون جہاں ایک طرف اپنے قارئین کو ادب کی نئی سمتوں، نئے زبان و بیان سے روشناس کرا رہا تھا، اور جس سے ہم جیسے نوجوان متاثر ہو رہے تھے، وہیں دوسری طرف میرؔ و غالبؔ کی تفہیم ایک نئے انداز سے کر رہا تھا۔ اس نے ہمارے سامنے میر فہمی اور غالب فہمی کی نئی راہیں کھولیں، اور سب سے بڑھ کر شمس الرحمن فاروقی کی اس ضد نے ہمیں ان کا شیدائی بنا دیا کہ کسی حال میں ادب اپنے معیار سے نیچے نہ اترے۔ جو چیز ہمارے نزدیک خوبی تھی وہی ایک بڑے حلقہ میں برائی سمجھی گئی، اور یہ الزام لگایا گیا کہ شمس الرحمن ادب کا رشتہ معاشرہ سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ انہیں ناعاقبت اندیش لوگوں کا دباؤ ہے کہ ندوہ کے لوگ غیر معیاری زبان یہ کہہ کر استعمال کرتے ہیں کہ ہم جس معاشرہ میں جیتے ہیں اس کی زبان یہی ہے۔

ALAWRAAQ
Publications
www.alawraaq.com

آکسفورڈ میں ذکر شمس الرحمن

میں سنہ ۱۹۹۱ میں آکسفورڈ آگیا اور شبخون سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا۔ سنہ ۱۹۹۵ میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر نعیم الرحمن فاروقی صاحب ایک سال کے لئے آکسفورڈ تشریف لائے، اور انٹلکچول اینڈ سوشل ہسٹری آف مسلم ورلڈ کے اس علمی پروجکٹ پر کام کرنے کے لئے ان کا تقرر ہوا جس پر میں کئی سالوں سے لگا ہوا تھا۔ اسی دوران لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے پروفیسر محمد مزمل صاحب بھی تشریف لائے، اور ہم تینوں میں قربت بڑھی۔ ایک مدت کے بعد ادب وشاعری کی مجلسیں زندہ ہوئیں۔ کبھی میرے مکان پر اور کبھی ان کی رہائشوں پر ہماری نشستیں پابندی سے ہونے لگیں۔

نعیم الرحمن صاحب نے کسی موقع پر ذکر کیا کہ شمس الرحمن فاروقی ان کے بڑے بھائی ہیں، اور وہ گاہے بگاہے اردو ادب و تنقید میں ان کے کارناموں کا تذکرہ بھی کرتے۔ نعیم الرحمن صاحب اپنے بھائی کا نام ہمیشہ تعظیم سے لیتے، اس طرح جیسے ایک فرمانبردار بیٹا اپنے باپ کا نام لیتا ہے، یا جس طرح ایک لائق شاگرد اپنے محسن استاد کا نام لیتا ہے۔ ان مجلسوں سے شمس الرحمن فاروقی کی عقیدت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

لندن کی ایک شام شمس الرحمن کے نام

اسی دوران انڈین پوسٹل سروسز سے سبکدوشی کے بعد شمس الرحمن فاروقی کی لندن آمد کے موقع پر ادب نواز دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا۔ میں بھی نعیم الرحمن فاروقی کے ساتھ اس میں شریک ہوا۔ شمس الرحمن فاروقی نے مختلف ادبی موضوعات پر بے تکلفانہ باتیں کیں۔ اس زمانہ میں وہ داستان امیر حمزہ کی ڈکشنری تیار کر رہے تھے۔ زیادہ تر محور گفتگو یہی داستان اور ڈکشنری رہی۔ یہ داستان حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی ہے۔ داستان گویوں نے اسے ایرانی عناصر اور ہندوستانی رنگوں سے اس قدر بھر دیا ہے کہ یہ داستان کچھ کا کچھ بن گئی، اور چھیالیس جلدوں تک پہنچ گئی۔ فارسی اور ترکی کے مقابلہ میں اردو میں یہ داستان ناقابل یقین حد تک طویل ہو گئی۔ فاروقی صاحب نے تشریح کی کہ داستان امیر حمزہ ایک زبانی بیانیہ ہے۔ زبانی بیانیہ کے اپنے ضوابط اور رسومیات ہوتے ہیں۔ اس داستان میں بعض اوصاف وخواص ایسے ہیں جو دنیا کے کسی بیانیہ میں نہیں ملتے۔ ناول نگاری نے اس بیانیہ کی اہمیت پس پردہ ڈال دی۔ بالعموم داستان امیر حمزہ بلکہ ساری داستانوں کے بارے میں عام ادبی حلقوں میں یہ خیال رہا ہے کہ یہ واقعیت سے دور اور اخلاقی قدروں سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ داستان رزم، بزم، طلسم اور عیاری کے ارد گرد گھومتی ہے۔ داستان امیر حمزہ میں غیر معمولی وسعت، پیچیدگی اور رنگارنگی ہندوستان میں اور خاص کر اردو داستان گویوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ فاروقی صاحب نے اس پر زور دیا کہ داستان گو جب بھی داستان سناتا ہے تو وہ ہر بار اس داستان کو دوبارہ تصنیف کرتا ہے اس معنی میں کہ سنانے کے دوران داستان ہر بار کچھ نہ کچھ بدل جاتی ہے۔

اس ادبی محفل کے بعد ہم لوگوں نے محبان ادب و تنقید کی صحبت میں کھانا تناول کیا. شعر و تنقید ہی پر زیادہ گفتگو رہی. شمس الرحمن فاروقی نے مجھے مخاطب کر کے بطور مزاح فرمایا کہ اکرم صاحب! حیرت ہے کہ رندوں کی صحبت ایک عالم نے کیسے گوارا کرلی۔ کہاں شعر و تنقید اور کہاں مدرسہ! مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی ان قافلوں کو گزرے زیادہ دن نہیں گزرے جن میں سے ہر ایک نے مدرسہ کی چٹائیوں پر ادب وشاعری کا ذوق پیدا کیا تھا، اور جن کے دم سے دنیائے شعر وادب روشن وتابناک تھی:

عجب معیار ہے مے پرستو بزم ساقی کا

جنہیں ہم رند سمجھتے تھے وہ اکثر پارسا نکلے

پھر مجھے یاد آیا کہ اس میں قصور شمس الرحمن صاحب کا نہیں۔ مدرسوں سے جس طرح ادب کا ذوق ناپید ہوا ہے، اس کے بعد کسے حیرت نہیں ہو گی؟ علماء کو اپنی کمی دور کرنے اور شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنے پر توجہ دینی چاہئے۔ یہ زیبا نہیں کہ وہ اس نوع کے تبصروں پر منہ بسوریں:

یہ دنیا ہے اے شآد، ناحق نہ الجھو

ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

جامعہ ملیہ میں ایک یادگار نشست

فاروقی صاحب سے رشتہ تقریباً تیئیس سال منقطع رہا۔ سنہ ۲۰۱۹ میں میری ہندوستان آمد کے موقع پر پروفیسر ترنم صدیقی صاحبہ نے جامعہ ملیہ میں میرے ایک لکچر کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام کے انعقاد میں جامعہ کے شعبۂ انگریزی کی پروفیسر باراں فاروقی ان کی معاون تھیں۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا تعارف کرایا کہ شمس الرحمن فاروقی ان کے والد ہیں۔ یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے ایک بار فون کر کے بتایا کہ جن دنوں جامعہ میں میرا لکچر ہو گا فاروقی صاحب بھی ان دنوں دہلی میں ہوں گے۔ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ اس سیمینار کی صدارت کرلیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں جلسہ گاہ میں پہنچا، فاروقی صاحب میرے منتظر تھے، پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ لندن کی ملاقات اب تک ان کے حافظہ میں تھی۔ ان کو میں نے اپنی انگریزی کتاب المحدثات کا ایک نسخہ پیش کیا۔ انہوں نے میرا لکچر غور سے سنا اور اپنے صدارتی کلمات میں اسے بہت سراہا۔ بعد میں بہت دیر تک اس خطاب کی اہمیت پر گفتگو کرتے رہے، اور از راہ تواضع انہوں نے اس کا بھی اظہار کیا کہ میرے لکچر سے کتنی نئی باتیں ان کے علم میں آئیں۔

اس کے بعد ان سے ان کی جدید تحریروں اور ادبی کاوشوں کے متعلق گفتگو ہوئی۔ اس آخری ملاقات میں بھی مجھے ان کے خیالات وہی نظر آئے جن کی ایک جھلک میں نے لندن میں دیکھی تھی، اور جن سے میں شب خون کے صفحات پر مانوس تھا۔ اور شاید ادب کے مؤرخین کو ان کی اس بات سے اختلاف نہ ہو: "ادب کے بارے میں میرے نقطۂ نظر میں کوئی خاص تبدیلی، کچھ باتوں میں تاکید کی کمی، اور کچھ باتوں میں تاکید کی زیادتی کے علاوہ نہیں آئی۔"

اس پروگرام کے بعد بھی ان کی صاحبزادی باراں فاروقی کے فون آتے رہے جن میں وہ بالعموم فقہی سوالات کرتیں اور اسی بہانہ اپنے والد صاحب کی خیریت سے مطلع کرتیں۔ کل پروفیسر ترنم صاحبہ سے فون پر بات ہوئی اور اس عظیم حادثہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ باراں فاروقی کو میرا تعزیتی پیغام پہنچا دیں گی۔

فاروقی صاحب سے میری یہی دو ملاقاتیں ہیں، اور یہ میرے لئے یادگار اور باعث فخر و مسرت ہیں۔ ایک ایسا ادیب دوراں جس کی تحریریں زمانۂ طالب علمی میں مرعوب کرتی تھیں۔ پھر ایسا عہد بھی آیا کہ اس کی ہمنشینی کے مواقع میسر ہوئے۔

نقش پائیدار

شمس الرحمن فاروقی نے ادبی و تنقیدی فضا پر وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو ہماری تاریخ میں ہمیشہ پائیدار رہیں گے، اور ان کے خیالات و تصورات کے بغیر کوئی بھی ادبی اور تنقیدی بحث تشنۂ تکمیل رہے گی۔ وہ اپنے عصر کے سب سے زیادہ لکھنے والے اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب تھے۔ اور ان کا کمال یہ تھا کہ زیادہ لکھنے کے ساتھ وہ معیار قائم رکھتے تھے۔ وہ زبان کے معاملہ میں غیرت مند تھے، سوقیانہ پن اور ادبی بے راہ روی سے انہیں خدا واسطے بیر تھا۔

فاروقی صاحب کے یہاں صحیح معنوں میں تنوع تھا، یعنی شعر وادب کا کوئی ایسا رخ نہیں جس پر انہوں نے غور نہ کیا ہو، اس پر اپنے ہم عصروں سے گفتگو نہ کی ہو، اور اس تدبر و تامل کے نتائج اہل نظر کے سامنے نہ رکھ دیئے ہوں۔ فاروقی صاحب کے یہ سارے کمالات واوصاف ایک طرف، تاہم اہل نظر کے نزدیک ان کی سب سے نمایاں حیثیت ایک دیدہ ور نقاد اور ایک مبصر جمال شعر و نثر کی تھی۔

ALAWRAAQ
Publications
www.alawraaq.com